© rasailojaraid.com

مذہب اور تجدیدِ مذہب

(۴)

مذہبی بگاڑ کی مختلف صورتیں اور اس کے اسباب

(عبد الحمید صدیقی)

دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان کا نظام جن محکم بنیادوں پر قائم ہے ان میں ایک تو اَن دیکھے خدا کی پرستش ہے، دوسری اُس کے منشا اور ارادہ کی وضاحت کرنے والی الہامی کتاب، اور تیسرے اس کتاب کو بنی نوع انسان تک پہنچانے والی، اور تعلیمات ربّانی کی عملی تشریح و توضیح کرنے والی وہ بزرگ و برتر ذات جسے دینی اصطلاح میں نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود انسان کا روپ دھار کر اپنی تعلیمات کے عملی پہلوؤں سے انسان کو آشنا کرنے کے لیے نہیں آتا بلکہ یہ اہم ذمّہ داری اپنے رسولوں کو سونپتا ہے، اس لیے انبیاء علیہم السّلام تعلیماتِ ربانی کے صحیح معنوں میں شارح اور امین ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف منشائے الٰہی کے اسرار و رموز انسانوں کو سمجھاتے ہیں بلکہ اُس کی بالکل صحیح تعبیر بھی اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ تشریح و تعبیر بھی تعلیماتِ الٰہی کا ایک ضروری حصّہ ہوتی ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام منشاء الٰہی کی وضاحت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ باری تعالیٰ کا اشارہ پا کر ہی کوئی بات فرماتے ہیں۔ اس لیے ان بزرگ ہستیوں کی تصریحات کلامِ ربانی کی من مانی تاویلات کی راہ میں سب سے زیادہ موثر اور سب سے زیادہ مضبوط رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں اور کوئی فتنہ جو اس حصار کی موجودگی میں منشائے الٰہی کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مذہب میں جب بھی فتنہ پردازوں نے بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے سب سے پہلے اس حصار کو توڑا جو کلام اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے گرد خود باری تعالیٰ نے قائم کر رکھا ہے اور پھر جب اس میں شگاف پیدا کر لیے تو اپنے منشا اور مرضی کے مطابق جس طرح چاہا کلامِ الٰہی میں بے دریغ تحریف کرتے چلے گئے۔

تعلیماتِ ربانی کی من مانی تاویلات کے جواز کے لیے انہوں نے سب سے پہلے عوام کے دلوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ وہ انبیاء علیہم السّلام کے وارث اور جانشین ہونے کی وجہ سے ہر عیب سے پاک اور ہر خطا سے منزّہ ہیں وہ کشف کے ذریعے خداوند تعالیٰ کے منشا کو براہِ راست معلوم کر سکتے ہیں اور اُس کے رسول سے روحانی ربط پیدا کر کے اُس سے بلا واسطہ مستفیض ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے انبیاء علیہم السلام کے محرمِ راز ہونے کی وجہ سے اُن پر ایسے اسرار و رموز کھلتے ہیں جو عوام کی حدِ ادراک سے ماوراء ہیں۔ اُن کی زبان فیض ترجمان سے نکلی ہوئی ہر بات درحقیقت کلامِ الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ خدا کی طرف سے القاء کی ہوئی باتوں کو ہی عوام پر آشکارا کرتے ہیں۔

آپ خود غور فرمائیے جب کچھ حضرات عوام سے یہ منوالیں کہ مذہب کے کچھ گوشے ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں ان حضرات کے سوا اور کسی کو کوئی معلومات نہیں تو انہیں لوگوں کو ذہنی اور جذباتی طور پر اس بات پر آمادہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں پیش آتی کہ وہ ان کی غیر مشروط پیروی کو ہی ذریعۂ نجات سمجھیں اور اُن کی زبان سے نکلے ہوئے ہر ارشاد کو حکمِ خداوندی سمجھ کر بلا چون و چرا قبول کرتے چلے جائیں۔ چنانچہ ان حضرات نے اپنے تقدس اور اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ قرب کے نام پر خوب فائدہ اٹھایا اور دین کے اندر ایسے ایسے فتنے کھڑے کر دیئے جنہیں مدتوں تک دبایا نہ جا سکا۔

یہ بزرگ گو زبان سے یہی کہتے تھے کہ وہ خدا کے عاجز بندے اور اس کے انبیاء علیہم السلام کے ادنیٰ خادم ہیں اور تعلیماتِ الٰہی کی مخصوص تعبیر کا انہیں جو حق حاصل ہے وہ بھی خدا کا احسان اور نبی کی برکت ہی ہے۔ لیکن اُن کی عملی زندگی میں اس بات کی قطعاً کوئی شہادت نہ ملتی تھی کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ فی الحقیقت خدا کے بندے اور رسول کے پیرو ہیں۔ اگر وہ فی الواقع بندگی کے مقام پر رہتے اور رسول کو ہی اپنا مطاع سمجھتے تو کبھی بھی اپنی ذاتی خواہشات اور تمناؤں کو اور اپنے ذاتی تفکرات اور تصورات کو مذہب کے اندر شامل نہ کرتے۔

ان کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہے کہ یہ حضرات اپنی من مانی کارروائیوں کے لیے ہمیشہ ایک ہی دلیل پیش کرتے رہے ہیں کہ زندہ و جاوید خدا انہیں ہر بات سے خود آگاہ کر دیتا ہے اور پردۂ غیب میں چھپا ہوا رسول خود ان کے پاس تشریف لا کر ان کی بلا واسطہ معاونت اور رہنمائی فرماتا ہے۔ ان میں سے بعض بزرگ تو یہاں تک دعوے کرنے لگے کہ نبی اُن کے اندر حلول کر گیا ہے اور اس بنا پر لوگوں کو انہیں اُسی عزت و احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیے جس نظر سے انبیاء علیہم السلام کو دیکھا جاتا ہے اور انہیں وہی بلند و بالا مقام دینا چاہیے جس کے کہ انبیاء علیہم السلام مستحق ہوتے ہیں۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ان بے سر و پا دعووں کی بنیاد عقل نہ تھی بلکہ باطنی علم اور کشف تھا۔

(۲) مذہب کے اندر رسول کے صحیح مرتبہ کو نقصان پہنچانے والے دوسرے گروہ نے ایک دوسرے انداز سے خدائی کا دعویٰ کیا۔ پہلے گروہ نے تو یہ کہہ کر اپنی خدائی کا سکہ منوایا کہ زندہ رسول سے براہِ راست روحانی تعلق کی بنا پر وہ اس بات کا پورا پورا استحقاق رکھتا ہے کہ جو بات بھی وہ کرے اسے فرمانِ رسول سمجھ کر قبول کیا جائے لیکن اس دوسرے گروہ نے ارشاداتِ رسول کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ ارشادات مذہب کا ضروری حصہ نہیں ہیں۔ نبی نے اپنے عہد کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اگر کوئی بات کی ہو تو یہ کلام ربانی کی طرح مستقل اور ناقابلِ تغیر نہیں ہو سکتی یہ ایک وقتی اور عارضی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر طرح کے لوگوں کو اس بات کا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق کلامِ الٰہی کی تعبیر کریں۔ پہلا گروہ رسول کا قائم مقام بنتا تھا۔ لیکن اس گروہ نے رسول کی تعلیمات ہی کو غیر ضروری کہنا شروع کر دیا۔ یہ فتنہ دنیا کے ہر مذہب میں اُٹھا اور اس نے کلامِ الٰہی کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا۔

اس فتنے کا آغاز ہمیشہ ایک نہایت ہی سادے اور معصوم سے دعوے سے کیا گیا ہے کہ انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی رہنمائی کے لیے بس اللہ کا کلام کافی ہے اور ہر شخص کو اس بات کا پورا پورا اختیار رہے کہ وہ اپنی ضرورت اور عقل کے مطابق اس سے رشد و ہدایت حاصل کرے۔ اس سلسلے میں ذرا مسیحیت کے مشہور مصلح مارٹن لوتھر کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

"یسوع مسیح کا ہر پیرو اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے لیے انجیل کی تعبیر خود کرے۔ یہ انجیل کسی ایک مخصوص طبقے کی میراث نہیں۔ اس میں ہدایت کے لیے بڑے واضح احکام موجود ہیں۔ ہر فرد اس کے اصولوں کو خود پرکھ سکتا ہے اور اُن کی اہمیت اپنی عقل کے مطابق خود متعین کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی روایت، کسی دستور کسی اخلاقی ضابطے۔ الغرض کسی خارجی رہنمائی کا محتاج نہیں۔"[1]

کلامِ الٰہی اور عقل دونوں کو انسانی رہنمائی کے لیے کافی سمجھنے والوں نے بغیر سوچے سمجھے ماضی کی ساری مقدس روایات کو علومِ دین کے ماہرین کی ٹھوس آرا کو، اور سب سے بڑھ کر اُن بزرگ و برتر ہستیوں کی علمی اور عملی توجیہات کو جن پر کلام اللہ نازل ہوا تھا، نظر انداز کر کے کتبِ سماوی کی من مانی تعبیرات شروع کر دیں اور اس طرح مذہب کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔

اس بگاڑ میں کوئی چیز بھی غیر متوقع اور انہونی نہ تھی۔ اللہ نے نوعِ بشری کی ہدایت کے لیے صرف چند پند و نصائح کا مجموعہ ہی نہیں بھیجا بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات کا نقشہ دیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے سپرد یہ کام کیا ہے کہ وہ اس نقشہ کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کر کے نوعِ انسانی پر اس حقیقت کو واضح کر دیں کہ اُسے اپنی حیات کو کس نہج پر ڈھالنا ہے۔ تعمیر کا یہ انداز بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ نقشہ، کیونکہ اگر یہ نمونہ ہمارے سامنے موجود نہ ہو تو پھر اس نقشہ کے عملی مضمرات سامنے نہیں آ سکتے۔ اب اگر ایک فرد یا گروہ تعمیر کے اُس مثالی ڈھانچے کو یکسر نظر انداز کر کے صرف نقشے کی مدد سے انفرادی یا اجتماعی زندگی کی تعمیر کا عزم کرتا

[1] CHARLES BEARD: THE REFORMATION P. 124.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے تو وہ اس بات پر مجبور رہے کہ تعمیر کے لیے کچھ دوسرے نمونے سامنے رکھے۔ انسانی ذہن کبھی بھی خلا میں کام نہیں کرتا۔ اس کے ذہنی پس منظر میں ہر اصول، ہر نظریہ، ضابطہ یا نصب العین کی ایک عملی صورت بھی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً آپ نیکی کا تصور نیکی کے چند ٹھوس واقعات یا چند نیک انسانوں کی عملی زندگی کو نظروں کے سامنے لائے بغیر کبھی نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح مذہبی احکام اور اُس کی تعلیمات بھی اس بات کی محتاج ہیں کہ اُن کی مکمل مثالی اور صحیح عملی تصویر نہ صرف انسان کے ذہن پر مرتسم ہو بلکہ وہ مستند کتابوں اور مقدس روایات میں بھی محفوظ ہو تاکہ ہر نسل کی تربیت کرتے ہوئے اس تصویر کا نقش اس کے دل و دماغ میں بڑی آسانی کے ساتھ بٹھایا جا سکے۔ اب اگر ایک گروہ اپنی حماقت سے اس تصویر کو مٹا ڈالتا ہے تو وہ درحقیقت کسی فرد یا قوم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ مذہب کی عملی توجیہ کے لیے کچھ دوسری تصاویر اپنے ذہن میں رکھے۔ یہ تصویریں بالعموم کسی رائج الوقت نظام کے چربے ہی ہوتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ مذہب کے اندر جب بھی کسی نبی اور رسول کی فیصلہ کن حیثیت کو ختم کیا گیا تو وہ مذہب اپنا امتیاز کھو کر وقت کے غالب رجحانات کا تابع مہمل بن کر رہ گیا اور وہ فیصلہ کن حیثیت جو کبھی رسول کو حاصل تھی وہ اُن لوگوں کو حاصل ہو گئی جو مذہب کو توڑ مروڑ کر کسی طرح عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے درپے تھے۔ اس طرزِ فکر کے حاملین نے مذہب کو جتنا شدید نقصان پہنچایا وہ کسی دوسرے گروہ کی ریشہ دوانیوں سے کم نہ تھا۔ ان کی کرم فرمائیوں کی وجہ سے مذہب اپنی انفرادیت کھو بیٹھا اور بنی نوع انسان کو رشد و ہدایت کا راستہ دکھانے کے بجائے وقت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ گیا۔ تعلیماتِ ربانی کی من مانی تاویلات کا کاروبار خواہ کشف یا مشاہدۂ باطنی کی بنیاد پر کیا جائے یا عقل اور عصری تقاضوں کی بنیاد پر، چند اسباب کی وجہ سے فروغ حاصل کرتا اور پھیلتا ہے

انسان کا اس دنیا میں اصل کام خدا کے رسولوں کی ہدایت کے مطابق اُس ذاتِ برحق کی عبادت ہے اور اس کا صحیح مقام اُس ذاتِ بے ہمتا کی بندگی ہے۔ لیکن انسان کے کھلے دشمن شیطان نے اُسے اپنے اصل کام سے ہمیشہ غافل رکھنے اور اُس کے صحیح مقام سے اُسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محروم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے شیطان کے فریب میں آکر مقامِ خداوندی کا دعویٰ کیا اور رب العالمین کی غلامی کا قلادہ گردن میں پہننے کی بجائے لوگوں سے غیر مشروط اطاعت کے طلبگار ہوئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ نظامِ مذہب میں نبی کی مستقل اور فیصلہ کن حیثیت کو زبان سے تسلیم کرنے کے باوجود کمزور کیا جائے اور لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ اُس بزرگ و برتر ہستی کی طرف سے اُن کے پاس کچھ ایسے سربستہ راز نہایت خفیہ طور پر منتقل ہوئے ہیں جن کا انہیں ہی علم ہے اور انہیں جاننے کے لیے صرف انہیں کی طرف رجوع کرنا اور انہیں پر اعتماد کرنا ناگزیر ہے۔ دوسرے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جائے کہ روحانی ریاضت سے انہوں نے ایک ایسا بلند و بالا مقام حاصل کر لیا ہے جس پر بیٹھ کر وہ نہ صرف اللہ سے براہِ راست ہمکلام ہو سکتے ہیں بلکہ اُس کے رسولوں سے بغیر کسی واسطے کے روحانی تعلق قائم کرکے ہر معاملے کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس بات پر مجبور نہیں کہ کلامِ الٰہی یا انبیاء علیہم السلام کے احکام و فرامین کی پابندی کریں۔ اُن کے مکلّف تو سطحی بیں اور کم علم لوگ ہیں۔ چونکہ اُن کی نگاہیں ظاہری پردوں کو چیر کر اُن عمیق گہرائیوں تک پہنچ سکتی ہیں جن تک عوام کی رسائی ناممکن ہے، اس لیے وہ اپنے اس خاص اعزاز اور امتیازی مرتبے اور مقام کی وجہ سے اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ دوسروں سے اپنی اندھی تقلید کا مطالبہ کریں۔

دوسری طرف انسانوں کی ایک معتدبہ جماعت نے ان کے اس سراسر ناجائز مطالبہ کو تین وجوہات کی بنا پر قبول کیا۔ ایک تو اس لیے کہ خیالات کے جو گورکھ دھندے انہوں نے تیار رکھے تھے اُن میں "پُراسرار" کا طالب اپنی تسکین کا وافر سامان فراہم کر سکتا تھا۔ دوسرے اُن کے محیر العقول طرزِ عمل نے انسان کی نظروں کو مفتوح کر لیا۔ اور تیسرے، یہ لوگ مذہب اور روحانیت کے نام پر بعض ایسے عقائد اور اعمال پیش کرتے جن سے مذہب کی پیروی غیر معمولی حد تک آسان ہو جاتی۔ ان کے مسلک کو اپنانے کے بعد انسان اُن ساری اُلجھنوں، دشواریوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مزاحمتوں سے بچ جاتا جو مذہب کو بطور نظامِ حیات قبول کرکے باطل کے خلاف صف آرا ہونے میں پیش آتی ہیں۔ یہاں ساری عمر کشف و کرامات کے سہارے چند دل پسند توہمات کو ذہن میں پال کر بڑی آسانی سے گزر جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو مذہب میں رسول کی فیصلہ کن حیثیت کو مٹا کر اور عقل کو امام بنا کر کلامِ الٰہی کی تعبیر و توجیہ کے لیے آگے بڑھے، انہوں نے بھی یہ سارا کھیل صرف اسی غرض کے لیے کھیلا کہ انہیں انسانی معاشرے میں غیر مشروط اطاعت کا حق حاصل ہو جائے۔ یہ درحقیقت شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ وقت کی اضطراری چال نے معاشرے کے سامنے جو نئے نئے تقاضے پیدا کیے ہیں وہ ان کا حل مذہب کے نظامِ اجتماعی کو سامنے رکھ کر پیش کرنے سے قاصر ہیں اور اس مقصد کے لیے ان تھک محنت، غیر معمولی غور و تفکر، دین کی گہری بصیرت، اور بے مثال عزم و ہمت درکار ہے تو انہوں نے رسول کی فیصلہ کن حیثیت کو ختم کرکے مذہب کے پورے اجتماعی نظام کو ہی درہم برہم کر دیا اور لوگوں کو اس بات کی آزادی دے دی کہ وہ مذہب کے اندر وقت کے تقاضوں کے مطابق جس طرح کی تبدیلی چاہیں پیدا کرلیں۔

نبی کی ذاتِ مقدس جو ہر پہلو سے مکمل اور کامل ہوتی ہے اور اس کا دائرہ کار پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ وہ اپنے مشن کا آغاز تطہیرِ افکار سے کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے لوگوں کے دل و دماغ کا جائزہ لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان کے اندر باطل افکار و نظریات کے کونسے جھاڑ جھنکاڑ موجود ہیں۔ چنانچہ وہ اوّل انہیں صاف کرنے کی فکر کرتا ہے پھر خداداد بصیرت، دانائی اور تدبر کے ساتھ ان میں صالح افکار و نظریات اور صحیح عقائد کے بیج بوتا ہے۔ اس فرض کو سر انجام دینے کے بعد وہ اس بنیادی کام سے غافل نہیں ہوتا بلکہ موعظت و حکمت کے ذریعہ اس بیج کی مسلسل آبیاری کرتا رہتا ہے۔ تلقین و ترغیب کے کام میں وہ پیغمبرانہ بصیرت سے کام لیتا ہے کبھی وہ رائج الوقت نظامِ فکر کے اُن گوشوں کا جائزہ لیتا ہے جن میں حق و صداقت کے اجزا غالب ہوتے ہیں پھر خدا پرستی کے ان مانوس اور متعارف تصورات کی مدد سے وہ عوام کے دل و دماغ پر باری تعالیٰ کی ذات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اُس کی صفات کا صحیح نقش بٹھاتا ہے۔ اور اُن کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں بیدار کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ ایک طرف وہ حق کو اچھی طرح پہچان کر اُسے اپنانے کی کوشش کریں اور دوسری طرف مروجہ نظامِ فکر میں جو خامیاں موجود ہیں اُن کی نوعیت کو جان کر نہ صرف خود اس سے دستکش ہوں بلکہ بنی نوعِ انسان کو ان باطل اوہام کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کریں۔

پیغمبر کی تعلیمات کے نتیجے میں ایک ایسا علمِ کلام معرضِ وجود میں آتا ہے جس میں طرزِ استدلال تبرا حکیمانہ، سادہ اور صحیح ہوتا ہے اور وہ اُن لوگوں کو دینِ حق کا فوراً گرویدہ بنا لیتا ہے جن کی فطرت سلیم ہو یا جنہیں مفادات نے حق کو پہچاننے میں بالکل اندھا نہ کر دیا ہو۔ اسی حقیقت کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اپنے ساتھ جو تعلیمات لیکر آتا ہے اسے لوگوں کے قلب و دماغ میں اتارنے کے لئے ایک نئی حکمت، ایک نیا طرزِ استدلال بھی پیش کرتا ہے جس سے لوگوں کے ذہنوں میں اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ ہم اسے نئی حکمت اور نیا طرزِ استدلال اس وجہ سے نہیں کہتے کہ ان میں کوئی جزو بھی قدیم نہیں ہوتا اور یہاں ہر پہلو نیا ہی ہوتا ہے بلکہ ہم اسے جدید اس لیے کہتے ہیں کہ پورے نظامِ فکر کے اعتبار سے یہ الگ اور جداگانہ ہوتا ہے اگرچہ اس نئے نظام میں پرانے نظام کے صالح اجزا کسی حد تک شامل ضرور ہوتے ہیں۔

نبی دفعتاً خلا میں مبعوث نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک فکری اور نظریاتی ماحول میں رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے اس لیے وہ رائج الوقت نظامِ فکر کے صالح اجزا چھانٹ کر اس مانوس اور متعارف حکمت کے ساتھ عوام کو حق کا فدائی بناتا ہے۔ وہ صرف قدیم نظام کے اچھے اجزا کو باطل اجزا سے الگ کرنے کا کام ہی نہیں کرتا بلکہ عقل کو اس کے صحیح حدود سے آشنا کرتا ہے اور انسانی زندگی میں اس کے صحیح مرتبہ اور مقام کو متعین کر کے ایک ایسے فطری علمِ کلام کی تدوین کرتا ہے جس سے انسانی ذہن فوراً حق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس کی معرفت حاصل کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ قرآن مجید، سنتِ نبوی، بائیبل اور توریت پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ کس سادہ طرزِ استدلال کے ساتھ جو انسانی فطرت کے لیے کسی اعتبار سے بھی غیر مانوس نہیں، دینی حقائق کو ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اُن کے جاں نثار کسی لمبی چوڑی منطقی بحثوں میں اُلجھے بغیر حق کا پرچار کرتے ہیں اور بڑے سادہ دلائل کے ساتھ بڑے مشکل سے مشکل مسائل سلجھا دیتے ہیں۔ آپ حیات بعد الموت جیسے ادق اور پیچیدہ مسئلے کو لیں اور دیکھیں کہ اسے ذہن نشین کرانے کے لیے روزمرہ زندگی میں سے کتنی عام فہم اور متعارف مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ کبھی انسان کی توجہ نیند اور بیداری کی دو مختلف حالتوں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے اور ان کے ذریعہ زندگی اور موت کی کیفیات کو سمجھایا جاتا ہے کبھی اسے قادرِ مطلق کی بے پناہ قدرت پر غور کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور اُس کے ذہن کو یہ بدیہی حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ جو خالق اتنی وسیع و عریض کائنات کو تخلیق کرنے پر قدرت رکھتا ہے اُس کے لیے یہ بات کچھ مشکل نہیں کہ وہ انسان کو زندگی سے محروم کر دینے کے بعد پھر اسے یہ متاع لوٹا دے۔ کبھی قرآن انسان کو زمین کی مختلف حالتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اسے یہ ذہن نشین کراتا ہے کہ جس طرح مردہ زمین خالق و مالک کی رحمت سے زندہ ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح تنِ مُردہ میں بھی اُس کے اشارے سے زندگی کی لہر دوڑ سکتی ہے اور اس میں کوئی چیز بھی خلافِ عقل نہیں۔

آپ قرآن مجید، احادیث نبوی اور دیگر کتبِ سماوی پر جتنا غور کریں گے آپ کو معلوم ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام نے عقائد کو دل و دماغ میں راسخ کرنے کے لیے ایک ایسے طرزِ استدلال سے کام لیا جو سادہ اور حکیمانہ ہونے کی وجہ سے انسانی فطرت اور اُس کے مزاج سے قریب ترین ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی، کوئی الجھن، کوئی مجادلانہ رنگ نہ تھا۔ فطرت کے ٹھوس اور سادہ حقائق کو بالکل فطری انداز میں ذہنوں کے اندر اتارنے کی کوشش کی گئی۔ اس وجہ سے جب بھی انبیاء علیہم السلام دنیا میں کوئی دعوت لیکر آئے تو اس دعوت سے عوام کو روشناس کرانے اور پھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کا انہیں علمبردار بنانے کے لیے انہوں نے تفہیم کے لیے ایک نئے طرزِ استدلال سے کام لیا۔

مگر افسوس یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ انبیاء علیہم السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اُن کے پیروؤں نے اُس سادہ نظامِ فکر اور طرزِ استدلال کو نظرانداز کر دیا جس کی مدد سے اللہ کے یہ پاکباز بندے دینی عقائد کو عوام کے ذہن میں راسخ کرتے تھے۔ آنے والی نسلوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری رجحانات کے مطابق عقائد کی تعبیر و تشریح شروع کی تاکہ انہیں وقت کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے اور یہیں سے عقاید میں بگاڑ شروع ہوا۔ مسیحیت کے نظامِ عقائد میں ہمیں آج جو عجیب و غریب افکار ملتے ہیں وہ سارے دین کے اُن بہی خواہوں کی موشگافیاں اور فلسفہ طرازیاں ہیں جو انہیں یونانی تصورات کے عین مطابق بنانا چاہتے تھے۔ خود مسلمانوں کے ہاں ہمہ اوست اور وحدۃ الوجود کی جو مختلف بحثیں ملتی ہیں اُن کے چشمے بھی انہیں افکار سے پھوٹتے ہیں۔ جب کوئی قوم کسی وقتی طرزِ فکر کو معیار بنا کر اللہ کے دین کو اُس پر پرکھنے کی کوشش کرتی ہے تو اُس میں دانستہ اور نادانستہ طور پر ایسی تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوتی ہے جن سے دین کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ہم اس مسئلہ پر سرسید کے باب میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث کریں گے۔ البتہ یہاں ہم مختصراً اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سرسید نے جس عہد میں جنم لیا اُس میں طبیعیات اور اُس کے قوانین نے دنیا کی نظروں کو خیرہ کر رکھا تھا۔ ان قوانین میں ایک قانون، اصول یکسانیتِ فطرت بھی ہے۔ یعنی فطرت کے ضابطے اٹل اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ جو شخص اس اصول پر ایمان رکھتا ہو وہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سرسید اور اس باب میں اُن کے ہمنوا معتقدین، جسٹس امیر علی، مولوی چراغ علی اور مولوی محمد علی لاہوری نے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے معجزات کی ایسی تعبیر کرنی شروع کر دی جس سے تعلیماتِ قرآنی اور اصولِ یکسانیتِ فطرت کا کسی مرحلہ پر بھی تصادم نہ ہونے پائے۔ آپ اگر ان حضرات کی توجیہات پڑھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ انہوں نے قرآن کو اس اصول کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے ایسی عجیب و غریب تاویلات پیش کی ہیں جن کی کلامِ الٰہی میں کسی طرح بھی گنجائش نہیں نکلتی اور جو صاف طور پر تحریفات کے ذیل میں آتی ہیں۔

اس گروہ کے برعکس دوسری طرف دین کے بہی خواہوں کا وہ گروہ ہے جس نے عصری افکار و نظریات کو یکسر نظر انداز کر کے دینی عقائد کو عوام کے دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ان حضرات کی مخلصانہ کوشش دین کو انحطاط سے بچانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ ایک انسان کا ذہن جب تک کسی نظریہ سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اُسے پُوری یکسوئی کے ساتھ کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ وہ اسی نظریہ کو اپنانے کی کوشش کرے گا جس کی صحت اور صداقت کا اسے پُورا پُورا یقین ہو اور پھر اس ایقان کی لازوال دولت پا کر ہی وہ اسے ہر دوسرے نظریہ سے سربلند دیکھنے کا نہ صرف آرزومند ہوتا ہے بلکہ اس کے لیے ہر قسم کے ایثار پر بھی آمادہ ہوتا ہے۔ ایک فرد یا چند افراد کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ وہ عصری افکار و تصوّرات سے یکسر بیگانہ رہ کر زندگی گزار لیں لیکن پُوری قوم کے لیے وقت کے غالب نظریات سے یکسر صرفِ نظر کرنا بالکل ناممکن ہے۔ دین کے جن خادموں نے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے دین کو پھیلانے کی کوشش کی، اُن کی نیّت میں خواہ کتنا خلوص اور عزم میں کتنی پختگی تھی لیکن وہ دین کو ایک غالب قوت نہ بنا سکے۔ ان حضرات کی غفلت کی وجہ سے دینِ حق کی حیثیت اس سکّے کی بن جاتی ہے جسے اصحابِ کہف کے بیدار ہونے پر اُن کا ایک ساتھی جب سامانِ خور و نوش خریدنے کے لیے بازار لے کر گیا تو نہ صرف بازار کو بلکہ ملک کو حیرانی میں ڈال دیا کیونکہ وہ ایک ایسا سکّہ تھا جس کا اب بازار میں چلن نہ رہا تھا۔ دین زرِ خالص ہے جسے ہر عہد کے سلیم الفطرت لوگ پُورے جذب و شوق کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے لوگوں کے فکر و نظر کے زاویوں کو درست کیا جاتے تاکہ اس زرِ خالص کو پہچاننے میں انہیں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکر و نگاہ کی درستگی مروجہ افکار و نظریات سے تعرض کیے بغیر تو نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دین کے علمبردار ہر دور کے تصورات کا ناقدانہ جائزہ لیں اور اُس طلسم کو توڑنے کی کوشش کریں جو ان نظریات نے لوگوں کے دل و دماغ پر قائم کیا ہُوا ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ طلسم اُسی صورت میں ٹوٹے گا جب ان کے ناقدین ان کے اندر جھانک کر اُن خامیوں اور لغزشوں کا کھوج لگائیں گے جو باطل نظامِ حیات میں موجود ہیں۔ اس بنا پر جو حضرات وقت کے غالب رجحانات کا زور توڑے بغیر دین کی سربلندی کا عزم کرتے ہیں وہ اپنے مقصد میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتے بلکہ ان کی اس کوشش سے بالعموم تین طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۱) یہ حضرات چونکہ دین اور اس کی تعلیمات کے بارے میں نوخیز نسلوں کے ذہنوں کو مطمئن نہیں کر سکتے اس لیے ان کی زیادہ سے زیادہ اپیل جذبات سے ہوتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین جو درحقیقت ایک مکمل نظامِ فکر و عمل ہوتا ہے وہ سراسر ایک جذباتی چیز بن کے رہ جاتا ہے۔

دین میں بلاشبہ جذبات کا بھی ایک حصہ ہے اور بغیر جذباتی لگاؤ اور وابستگی کے دین کا مقصد پُورا نہیں ہوتا لیکن جب عقل کو خارج کر کے محض جذبات کے سہارے عقائد کے کسی نظام کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا ایک اثر تو یہ ہوگا کہ معتدل اور ٹھنڈے مزاج کے غور و فکر کرنے والے لوگ اُسے قبول کرنے میں متامل ہوں گے۔ ممکن ہے معاشرے کے دباؤ کی وجہ سے وہ حضرات اپنی دین بیزاری یا دین کے بعض شعبوں کے متعلق اپنے شبہات کا برملا اظہار نہ کریں۔ لیکن وہ دل کی گہرائیوں سے کبھی مطمئن نہ ہوں گے اور محض ظاہرداری کے طور پر دین سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ تو دین کی چھاپ اُن کی زندگی کے کسی گوشہ میں نظر آئے گی اور نہ وہ اپنی اولاد کی اس کے مطابق تربیت کریں گے اور نہ ہی اُس کے علمبردار بن کر اُسے پھیلانے کے لیے فکرمند ہوں گے۔ ایک انسان دل و جان سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صرف اسی نظریہ کو اپناتا ہے جس پر اس کا دل پُوری طرح مطمئن ہو، اور جب وہ اسے ایک مرتبہ قبول کر لیتا ہے تو اس کی پُوری پُوری حفاظت کرتا ہے اور اسے فلاح و کامرانی کا سب سے مُوثر ذریعہ سمجھ کر نہ صرف خود اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے اہل و عیال کی اس کے مطابق تربیت کرتا ہے بلکہ دوسروں کو اُسے اپنانے کی پوری شدت کے ساتھ تلقین کرتا ہے۔ لیکن جب کسی نظریۂ حیات کے بارے میں کسی شخص کے ذہن میں مختلف شکوک و شبہات ہوں تو وہ نہ خود اُسے پوری یکسوئی اور اخلاص کے ساتھ قبول کرے گا اور نہ دوسروں کو قبول کرنے کی دعوت دیگا۔ ان حالات میں دین کی حیثیت ایک ایسے نعرے کی سی ہو جائے گی جسے بلند کر کے عوام سے وقتی طور پر داد لی جا سکتی ہو یا اُن کے جذبات سے کھیلا جا سکتا ہو دین کا کھوکھلا نعرہ آخر اسے کتنے دنوں تک زندہ رکھ سکتا ہے۔

(ب) دین کے ساتھ محض جذباتی لگاؤ کی وجہ سے انسان بالکل فطری طور پر اُس کے صرف انہیں حصّوں کو اپناتا ہے جن سے اُس کے جذبات کی تسکین ہوتی ہو اور باقی شعبوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس سے دین اور دنیا کی تفریق کا غلط تصور معرضِ وجود میں آتا ہے۔ وہ اپنے دنیاوی معاملات کو دین کی بنیادوں پر اُستوار کرنے کے بجائے وقت کے فکری رجحانات پر اُستوار کرتا ہے اور دین کو صرف محراب و منبر اور گیان دھیان تک محدود کر دیتا ہے۔ دین کے اندر وجد و حال کی کیفیات اسی جذباتیت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

(ج) اس طرزِ فکر کا نتیجہ انسانی طبائع پر بھی مترتب ہوتا ہے۔ انسان پُورے دین اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک متوازن نگاہ ڈالنے کے بجائے صرف اُس کے چند دلپسند گوشوں سے غیر معمولی دلچسپی پیدا کر لیتا ہے اور پُورے دین کو ان میں سمٹا ہُوا سمجھ کر اُن کے بارے میں غیر معمولی حسّاس ہو جاتا ہے جس سے اس کے فکری توازن میں بالکل قدرتی طور پر اختلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایسی بیکار بحثوں میں اُلجھا لیتا ہے جو دین کے اندر یا تو سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں یا بہت کم اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مسالک کے درمیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عرصہ دراز سے جو سر پھٹول ہو رہی ہے اس کے اسباب پر اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بڑی معمولی معمولی چیزیں نزاع کا موجب بنی ہوئی ہیں۔ ان کے درمیان بنیاد اور اصول کے اختلاف کی بہ نسبت جذبات کا اختلاف کہیں زیادہ ہے۔ دنیا کا ہر مذہب بنیادی عقائد اور اصول و فروع کا ایک جاندار مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر جب جذبات کی شدت فکر و نگاہ کے زاویوں کو متزلزل کر دیتی ہے تو پھر فروعات اصولوں کی جگہ لے لیتی ہیں اور انسانوں کی توجہ کا مرکز و محور بن جاتی ہیں۔ چونکہ انسان اُن کے ساتھ بالکل جذباتی وابستگی رکھتا ہے اس بنا پر وہ ان کے معاملے میں غیر معمولی حد تک حساس ہوتا ہے اور اُن کے متعلق کوئی ایسی بات سننا گوارا نہیں کرتا جس سے اُس کے جذبات کو ذرہ برابر بھی ٹھیس پہنچے۔ آج ہمارے ہاں جو مذہبی بحثیں ہوتی ہیں ذرا اُن کے موضوعات اور اُن پر اظہارِ خیال کے انداز کا جائزہ لیں تو آپ کو خود یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ آج مسلمان قوم نے کن چیزوں کو اپنا دین بنا رکھا ہے اور اپنی صلاحیتیں اور توانئیں کن کاموں میں کھپا رہی ہے۔

جب مذہبی ماحول میں جذباتیت غالب ہو تو اندازِ تبلیغ میں بھی حکمت اور تدبر کا جوہر مفقود ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ دین کے علمبرداروں کی نگاہیں اُن فکری اور عملی کوتاہیوں سے ہٹ جاتی ہیں جن میں امت مبتلا ہوتی ہے اور اُن کی ساری توجہ اُن مسائل پر صرف ہونے لگتی ہے جن میں اختلاف کے زیادہ سے زیادہ پہلو نمایاں کیے جا سکیں۔ پھر کسی بات کو حکمت اور دلسوزی کے ساتھ ذہن نشین کروانے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ کفر کے فتووں اور عذابِ الٰہی سے ڈرا دھمکا کر سیدھے سادھے عوام کو خاموش کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان حالات میں تکفیر کا ایسا طوفان اٹھتا ہے جس سے عوام مذہب اور اُن کے علمبرداروں سے یکسر متنفر ہو جاتے ہیں اور مذہب تنگ نظری، تعصب، رجعت پسندی اور بے وقوفی کا مترادف بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کے اندر ایک عام مذہبی بیزاری پھیلنے لگتی ہے اور وہ ہر اُس چیز سے نفرت کرنے لگتے ہیں جس کا مذہب سے کوئی دُور کا بھی تعلق ہو۔ مذہبی طبقوں کا معاشرے میں احترام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ختم ہو جاتا ہے۔ وہ طنز و تضحیک کا ہدف بن جاتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ رائے قائم کر لی جاتی ہے کہ یہ گروہ کسی افادیت کا حامل نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کا کام سراسر منفی نوعیت کا ہے جس میں سرِ فہرست اللہ کے نام پر لوگوں میں فساد پھیلانا ہے۔

عقائد سے گزر کر جب ہم اعمال پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں بگاڑ کے قریب قریب یہی اسباب ملتے ہیں۔

جب کوئی نبی دنیا میں مبعوث کیا جاتا ہے تو وہ عقائد و افکار کی طرح اعمال و افعال کا بھی ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس کے نتیجے میں ایک نیا طرزِ معاشرت، ایک نیا نظامِ معیشت، ایک نئی سیاسی ہیئت، ایک نیا نظامِ قانون، الغرض ایک نئی تہذیب معرضِ وجود میں آتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس تہذیب کے سارے اجزا بالکل نئے ہوں۔ اس میں رائج الوقت تہذیب کے صالح عناصر بھی شامل ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان عناصر کو چھانٹ کر نئی تہذیب کی تعمیر میں ان سے کام لینے کی نازک ذمہ داری خود نبی پر عائد ہوتی ہے اس لیے اس میں قطعاً کوئی خامی باقی نہیں رہتی۔ اللہ کا رسول اپنے خالق و مالک کی رہنمائی میں رائج الوقت اجتماعی نظام کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتا ہے پھر باری تعالیٰ کی عطا کردہ بصیرت کے مطابق ان کے اچھے اجزا کو الگ کرتا ہے اور ان میں ضروری ردّ و بدل کر کے انہیں دینی مزاج کے مطابق ڈھالتا ہے اور نئے نظامِ حیات کی تشکیل میں اُن سے جس قدر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو اٹھاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد کچھ مدت تک تو دینی نظام پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس میں اتنی غیر معمولی قوت و توانائی ہوتی ہے کہ جن دوسری تہذیبوں سے اس کا سامنا ہوتا ہے ان کے صالح اجزا کو جو اس کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں خود بخود جذب کر لیتا ہے اور انہیں اس طرح سے اپناتا ہے کہ وہ اسی کا ضروری حصہ بن کر رہ جاتے ہیں، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اجزا اسی دینی نظام کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوت و توانائی بہم پہنچانے کے لیے معرضِ وجود میں آتے تھے۔ اس طرح دینی تہذیب مسلسل ترقی کرتی رہتی ہے اور اس کا دائرہ برابر پھیلتا چلا جاتا ہے۔

مگر عقائد کی طرح یہ صورتِ حال بھی عرصۂ دراز تک قائم نہ رہ سکی۔ غیر دینی افکار و رجحانات اور خدا سے باغی قوموں کے افعال و اعمال نے دین کے لائے ہوئے نظامِ عمل میں سرایت شروع کی۔ آغاز میں سرایت کی رفتار بڑی سست اور اس کا عمل بڑا غیر محسوس تھا۔ پھر اسے روکنے کے لیے بڑے بڑے آئمہ، صلحاء اور فقہاء موجود تھے جو دین کا پورا فہم اور اس کے مزاج سے پوری مناسبت رکھنے کی وجہ سے ہر نئی چیز کو چھان پھٹک کر دیکھتے تھے اور عوام کو دو ٹوک انداز میں بتا دیتے تھے کہ آیا فلاں چیز قابلِ قبول ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس حد تک ہے۔ لیکن دین سے عوام کی وابستگی جتنی کم ہوتی چلی گئی ہے اسی نسبت سے اُن کا دینی شعور ماند پڑتا گیا اور باطل نظامہائے حیات کی بہت سی اقدار دینی نظام میں گھس آئیں۔ ان حالات میں نہ تو دین کے اندر اتنی قوت باقی رہی کہ وہ انہیں نکال پھینکے اور نہ علماء کے اندر اتنی دینی بصیرت، اور دین کی حفاظت کا اتنا جوش اور ولولہ باقی رہا کہ وہ نئی اقدار کے بارے میں وقتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر دینی مزاج اور اس کے مطالبات کے پیشِ نظر صحیح صحیح فیصلہ کر سکیں اور پھر اپنے اس فیصلے کو اپنی خدا ترسی، بے نفسی، دین کے اندر گہری بصیرت اور اس کے ساتھ غیر معمولی محبت کی بنا پر عوام سے منوا بھی سکیں۔

دین کا زیادہ تعلق چونکہ انسان کے باطن سے ہے اس لیے وہ فطری طور پر انہیں باتوں کو خوشدلی کے ساتھ آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے جن کے متعلق اُس کا ضمیر مطمئن ہو کہ یہی منشاء خداوندی ہے۔ اس بنا پر فقہی استنباط کی نوعیت عدالتی فیصلوں سے مختلف ہوتی ہے۔ عدالتوں کی طرف انسان دنیا کی سرخروئی کے لیے رجوع کرتا ہے لیکن فقہاء اور ائمہ کی خدمت میں وہ اس لیے حاضر ہوتا ہے کہ جن احکام کے بارے میں اُس کے خالق اور مالک نے کوئی تصریح نہیں کی اور جن کی وضاحت میں اللہ کے رسول نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا اُن کے متعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینی احکام حاصل کیے جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس نازک کام کے لیے عوام ہر شخص پر تو اعتماد نہیں کر سکتے۔ وہ اس معاملے میں صرف انہیں حضرات کی تصریحات اور فیصلوں پر اعتماد کر سکتے ہیں جن کے زہد و تقویٰ، جن کی للّٰہیت، جن کی علمی استعداد، حالات کے صحیح فہم و ادراک اور پھر دینی تعلیمات کو حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت پر انہیں پورا پورا بھروسہ ہو۔ یہ چیز مذہب کے مزاج کے خلاف ہے کہ رسول کی نیابت کا حق اُن لوگوں کو سونپ دیا جائے جو غیر دینی افکار و نظریات سے مرعوب ہو کر دین کے اندر ایسی تراش خراش شروع کر دیں جس سے اُس کا حلیہ ہی بگڑ کر رہ جائے۔

جب دنیا کے اندر بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوتا ہے تو عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آخر ہم کیوں لکیر کے فقیر بن کر فقہا کے فیصلوں کو بلا چون و چرا قبول کرتے رہیں۔ اگر ان حضرات کو سوچنے کا حق تھا تو ہم بھی یہ حق رکھتے ہیں اور اس سے کسی طرح بھی دستبردار نہیں ہو سکتے۔ اگر آئمہ سلف نے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر احکام خداوندی سے استنباط کیا تو ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ یہ بات بظاہر بالکل ٹھیک اور درست ہے کہ فقہا انسان تھے اور اُن سے غلطی کے سرزد ہونے کے امکانات موجود تھے۔ لیکن دورِ انحطاط میں "اجتہاد" کے معنی اور مدعا دونوں بدل جاتے ہیں اور جو لوگ اس طرح کا نعرہ بلند کرتے ہیں اُن کے سامنے دین کو سر بلند کرنے کے بجائے کچھ دوسرے مقاصد ہوتے ہیں۔ ان کی غرض اللہ کے منشا کو سمجھنا نہیں ہوتی بلکہ غور و فکر کے حق سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دین کے اندر نئے نئے فتنے اٹھانا ہوتی ہے۔ اس طبقے سے بھی دین کو بے حد نقصان پہنچتا ہے اور ان کے تجدد پسندانہ رجحانات سے دینی نظام کے اندر بعض ایسی چیزیں داخل ہو جاتی ہیں جن سے اُس میں زبردست اختلال رُونما ہوتا ہے۔

پھر ان حضرات کی مذموم کوششوں کا ایک خطرناک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ ان لوگوں کی خرافات کو امت کا اجتماعی ضمیر دینی احکام کی حیثیت سے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیے یہ لوگ بگڑے ہوئے حکمرانوں کے ساتھ ساز باز کر کے اپنے ان گمراہ کن خیالات کو قوت کے ذریعے عوام پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں زبردستی ان کا قائل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سازش کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں کبھی تو بگڑے ہوئے اصحاب اقتدار اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لیے ان علمائے سو کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں اور کبھی یہ بگڑے ہوئے منفتی اپنے گمراہ کن خیالات کی ترویج کے لیے بڑی عیاری کے ساتھ حکمرانوں کو استعمال کرتے ہیں۔

مذہب میں جہاں نری جذباتیت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ وہاں مجرّد عقل کی پیروی سے بھی اس میں کئی پہلوؤں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اگر مذہب کی صداقت کے لیے عقل کی گواہی کو ضروری قرار دیا جائے تو اس سے مذہب کے اصول ومبادی کی تو کسی حد تک تائید ہوتی ہے لیکن اس کے ہر ہر جزو کے لیے عقلی دلائل فراہم نہیں کیے جا سکتے۔ مذہب کے اندر بہت سے ایسے مافوق الطبیعی مسائل بھی آتے ہیں جن کی صداقت کی بنیاد وحی الٰہی ہے لیکن جن کے بارے میں عقل کوئی حتمی اور قطعی ثبوت فراہم نہیں کر سکتی۔ عقل کی بہر حال اپنی ایک حد ہے جس سے آگے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مجرّد عقل کی پیروی کرنے میں دوسری دقت یہ پیش آتی ہے کہ عقل کا خود کوئی اپنا لگا بندھا معیار نہیں جس کے مطابق ہر دور میں کسی عقیدہ کے بارے میں کوئی قطعی حکم لگایا جا سکے۔ آپ دیکھیے کہ آج ہم اس چیز کو عقل کے مطابق مانتے ہیں جس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ ہے لیکن یونانی فلسفہ میں بہت سے ایسے عقائد اور نظریات عقل کی رو سے صحیح اور برحق تسلیم کیے جاتے تھے جن کا تجربہ اور مشاہدہ سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا معجزات آج کے انسان کی نظر میں عقلی اعتبار سے ان ہونی باتیں ہیں لیکن آج سے چھ سات سو سال قبل کے انسان کے لیے معجزات کا انکار سراسر ایک غیر عقلی اور غیر فطری بات تصور کی جاتی تھی۔ مذہب کے بارے میں ہر دور میں جو نت نئی بحثیں چھڑتی ہیں اور نئے نئے شکوک وشبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہر دور اپنے ساتھ عقل کے نئے نئے تصورات لاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب اگر صرف عقل کو معیارِ حق و باطل بنا کر دینی عقائد کی صداقت کا فیصلہ کیا جائے تو مذہب میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونگی۔ ان حالات میں ہر دور کے "نام نہاد مفکرین" مذہبی عقائد اور اُس کے نظامِ عبادات میں ایسے تغیرات اور ایسی تحریفات کرنے پر مجبور رہینگے جو اُس دور کے عقلی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

مذہب کے بارے میں اس خالص عقل پرستانہ طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں سے وجدان اور جذبات کے سارے بیش قیمت عناصر کو خارج کرنا پڑا اور مذہب چند فلسفیانہ نظریات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ مذہب میں بلاشبہ عقل کا ایک حصّہ ہے اور دینی مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں عقل سے مفید کام لیا جا سکتا ہے لیکن دین جتنا ایک مربوط نظامِ فکر و عمل ہے اس سے کہیں زیادہ انسان کے قلبی اور روحانی احساسات و جذبات کی تسکین کا ذریعہ بھی ہے مذہب کی پیروی میں انسان ایک قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی پریشانیوں اور اُس کے مصائب سے گھبرا کر وہ اکثر اوقات اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں پناہ لیتا ہے جس طرح بچہ جب تاریکی کے بھوتوں سے ڈر کر بھاگتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اُسے اس خوف کی نفسیاتی وجہ سمجھائے بلکہ وہ ماں کی اُس محبت بھری گود کو تلاش کرتا ہے جو اُس کے اضطراب کو دور کرے اور اس کے خوف کو اطمینان اور سکون میں تبدیل کر دے۔ بالکل اسی طرح انسان کے لیے مذہب آغوشِ مادر کی حیثیت رکھتا ہے جس میں پناہ لیکر وہ اپنی بے چین روح کو تسکین اور آرام پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ خدا کو ایک اکائی یا ایک اصول نہیں سمجھتا بلکہ ایک ایسی زندہ اور شفیق ہستی خیال کرتا ہے جو اُس کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کر کے اُسے ہر وقت اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کے لیے تیار رہتی ہے، جو اُس کی نظر میں ماں سے زیادہ رحم دل اور باپ سے زیادہ کریم ہے۔ مذہب نے انسان کو ہمیشہ اپنی ذاتی پریشانیوں کو دور کرنے اور آلام و مصائب کو صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ مذہب انسان کا ایک زبردست سہارا ہے جو اُس کی مایوسیوں اور محرومیوں کو امیدوں سے بدل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتا ہے۔ ایک فرد پر جب ہر طرف سے عرصۂ حیات تنگ ہونے لگتا ہے جب اُس کے اعزہ اقارب اُس کی سیاہ بختیوں کی وجہ سے اُس سے مُنہ موڑ لیتے ہیں، جب انسان اوروں کے لیے تو کیا خود اپنے لیے بوجھ بن جاتا ہے، اُس وقت اگر انسان کو کوئی ذات سکون بخشتی ہے، اُسے صعوبتوں پر عبور پاتے اور عارفانہ تیور اور بے نیازانہ وضع کے ساتھ سب کچھ برداشت کرنے کے قابل بناتی ہے تو وہ رب العالمین کی ذات ہی ہوتی ہے جس سے قلبی تعلق پیدا کر کے انسان اپنے اضطراب کو سکون میں بدل لیتا ہے۔ اس اعتبار سے مذہب ہمیشہ دکھے ہوئے دلوں کے لیے مرہم اور مصائب سے نڈھال انسان کے لیے ایک بڑے سہارے کا کام دیتا رہا ہے۔

مذہب کی خالص عقلی تعبیر میں اُس کی یہ مربیانہ اور ہمدردانہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ علت و معلول کا ایک بے حس نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جن لوگوں نے مذہب کی عمارت کو خالص عقلی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی انہوں نے اس میں سے انسانیت کے لطیف عناصر مثلاً سوز و گداز، ایمان و ایقان اور عشق و محبت کو خارج کر دیا۔ خالص عقل نے جس مذہب کی تشکیل کی وہ علت و معلول کا ایک وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے جس میں دکھے ہوئے دلوں کا کوئی مداوا نہیں، جس میں روح کی تسکین کے لیے کوئی سامان نہیں، جس میں خدا کے ساتھ کسی ذاتی تعلق کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان حضرات کے نزدیک باری تعالیٰ محض ایک علت یا چند لگے بندھے قوانین اور اصولوں کا مجموعہ ہے۔ اس بنا پر اُس کے حضور میں تضرع و زاری یا اُس کی خصوصی رحمتوں کے لیے اُس کی بارگاہ میں التجا محض بیکار چیزیں ہیں۔ وہ ذات بے ہمتا انسان کے ساتھ کوئی ذاتی تعلق نہیں رکھتی۔ فطرت کے بے حس ضابطوں کی پابندی سے ہی اُس کا منشا پورا کیا جا سکتا ہے۔ آپ مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ جب بھی مذہب کو عقل کا تابع بنایا گیا تو اس کے بعد اس کی جو صورت سامنے آئی اُس میں خدا سے محبت کی بہ نسبت قوانینِ فطرت کی پیروی پر زیادہ زور تھا۔ اور انسانی روح کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تسکین و تشفی کے لیے کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ مذہب نے انسان کو علت و معلول کے رشتوں سے بیگانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ان رشتوں کی اہمیت کا پوری طرح احساس دلاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان کے ذہن میں یہ خیال بھی راسخ کرتا ہے کہ اس کا خالق و مالک ان رشتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا نہیں۔ وہ جب چاہتا ہے ان متعارف اور محسوس رشتوں کے واسطوں سے نہیں بلکہ ان سے الگ ہو کر بھی اپنے بندوں کی دستگیری کرتا ہے اور جب بھی وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ انہیں آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیتا ہے کیونکہ وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا اور تمام درگزر کرنے والوں سے بڑا درگزر کرنے والا ہے۔ اگر مذہب ان لطیف احساسات اور تصورات سے محروم ہو جائے تو پھر وہ مذہب نہیں بلکہ طبیعیات، معاشیات اور عمرانیات کا علم بن کر رہ جاتا ہے جو شاید انسان کی خارجی زندگی کو سنوارنے میں تو کسی حد تک مفید ہوں لیکن اس کے قلبی اور روحانی اضطراب کو دور کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

© rasailojaraid.com